سلاطینِ دہلی کے عہد میں

ہندوؤں کی حالت

سید حسن برنی

عام خیال ہے کہ اس دور میں ہندوؤں کی حالت مستقل تباہی، تکالیف اور بے بسی کی تھی اور ان پر ہر وقت ظلم و ستم ہوتے رہتے تھے۔

لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ کافی شہادتیں ملتی ہیں کہ بالعموم ہندو رعایا حفاظت، خوشحالی اور فارغ البالی سے رہتی تھی اور بے خبر مؤرخوں نے مصائب کے بیان میں مبالغہ اور رنگ آمیزیوں سے کام لیا ہے۔

دراصل سلطنت کی تبدیلی سے ملک کی عام حالت میں بہت زیادہ فرق نہیں آیا۔ یہ یقینی امر ہے کہ تاریخ کے اس دور میں عوام الناس کی حالت پچھلے زمانوں سے اگر بہتر نہ تھی تو بدتر بھی نہ تھی۔ بلاشبہ جس جماعت پر کچھ اس تبدیلی کا اثر پڑا، وہ حکمران طبقہ تھا۔ جس کے اقتدار میں قدرتی طور پر فرق آگیا تھا۔ پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ مسلمانوں سے پہلے اس ملک کی کیا حالت تھی۔ مسٹر دت نے قدیم ماخذوں کے حوالے سے اپنی تاریخ "تمدنِ ہند" میں لکھا ہے کہ بشیسٹھ اور بندھیت (۱۰،۱۸،۳۶) کے رو سے پادشاہ رعایا کی آمدنی سے ۱/۶ حصہ بطور ٹیکس لینے کا مستحق تھا۔ گوتم نے ٹیکسوں کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:

"۲۴۔ مزارعان پادشاہ کو (پیداوار کا) ۱/۱۰، ۱/۶، اور ۱/۸ ادا کرتے ہیں۔

۲۵۔ بعض کہتے ہیں مویشی اور سونے پر ۱۸۸ ٹیکس ہے۔

۲۷۔ جڑوں، پھلوں، پھولوں، دواؤں، بوٹیوں، شہد، گوشت، چارہ اور جلانے کی لکڑی پر ۱/۶۰۔

ہر پیشہ ور بادشاہ کو مہینے بھر میں ایک دن بے گار دے گا۔"

(ج ۱۔ ص ۲۲۲ و ج ۲۔ ص ۱۰۲)

آگے چل کر منگستھانیز (یونانی سفیر) کی سند سے لکھا ہے کہ ہر کاشت کار بادشاہ کو زمین کا لگان ادا کرتا تھا۔ تمام زمین بادشاہ کی ملک تھی۔ کوئی شخص ذاتی طور پر مالک نہ تھا۔ علاوہ لگان کے شاہی خزانہ میں پیداوار کا چہارم داخل ہوتا تھا۔ (ج ۱ ص ۲۵۲)

ہوان ژنگ نے لکھا ہے کہ جو لوگ شاہی زمینیں کاشت کرتے تھے انہیں پیداوار کا ۱/۶ ادا کرنا پڑتا تھا۔

(ج ۲، ص ۱۵۸)

مسٹر دت اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہندوؤں کے زمانہ میں عام طور پر پیداوار کا ۱/۶ حصہ بادشاہ کو دیا جاتا تھا۔

یہ امر مسلم ہے کہ ان مسلمان سلاطین نے ملک کے رواج کے مطابق، نیز اپنی شریعت کے اتباع میں زمینیں انہیں کاشت کاروں کے قبضے میں چھوڑ دی تھیں جو پہلے سے قابض چلے آرہے تھے۔ انہوں نے چودھریوں، مقدموں، خوطوں، راویوں، مہنتوں، پٹواریوں اور دوسرے ہندو عہدے داروں کو، جنہوں نے امتداد زمانہ کے ساتھ تقریباً موروثی حیثیت حاصل کرلی تھی، بدستور برقرار رکھا۔ اور ان سے اپنے مطالبوں کی وصولیوں میں مدد لیتے رہے۔ معاصر تاریخوں میں ان کا جابجا ذکر آتا ہے۔

بعض ٹیکس جو مسلمان بادشاہوں، مثلاً فیروز شاہ خلجی نے معاف کیے، ہندوستان کے لیے نئے نہ تھے بلکہ ہندوؤں کے زمانے سے چلے آتے اور عام طور سے مانے ہوئے تھے۔ ان مسلمان سلاطین کے عہد میں جو محصول کاشت کاروں سے لیا جاتا تھا، وہ بعض حالتوں میں تو ہندو راجاؤں کے مطالبوں سے بھی ہلکا تھا۔ چنانچہ اکثر اس کی مقدار عشر (یعنی ۱/۱۰) سے زیادہ نہ تھی۔ اس پر ہم جداگانہ مقالہ لکھ چکے ہیں جس میں اس دور کی مالیات سے بحث کی گئی ہے۔

مسٹر لین پول نے تسلیم کیا ہے کہ ابتدائی دور میں ہندو رعایا کے ساتھ مسلمان سلاطین ہند رواداری کا برتاؤ کرتے تھے۔ ہمارے خیال میں یہ طرز عمل برابر جاری رہا۔

علاء الدین خلجی، جو نہ مسلمانوں کی غیر معمولی دولت مندی دیکھ سکتا تھا نہ ہندوؤں کی، اس زمانے کے ہندو مقدموں اور خوطوں کی خوش حالی کا اس طرح ذکر کرتا ہے:

"خوطہ اور مقدم عمدہ گھوڑوں پر سوار ہوتے۔ نفیس کپڑے پہنتے، فارسی کمانوں سے تیر اندازی کرتے، باہم جنگ آزمائی میں مشغول اور شکار میں لگے رہتے ہیں۔ اور خراج، جزیہ، کری و چرائی کی بابت ایک چیتل بھی نہیں دیتے۔ خوطی کا حق علیحدہ گاؤں سے وصول کر لیتے ہیں۔ مجلسیں منعقد کرتے اور شرابیں پیتے ہیں اور بعض تو قطعاً بلانے یا نہ بلانے پر بھی دیوان شاہی میں حاضر نہیں ہوتے اور سرکاری محصلوں کی قطعاً پروا نہیں کرتے ہیں۔"

(فیروز شاہی، ص ۲۹۱)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک صدی میں جو علاء الدین خلجی کے وقت تک مسلمانوں کی سلطنت دہلی کو گزرے تھے، انہیں کتنی خوش حالی و فارغ البالی نصیب تھی۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپ و قیمتی تاریخی حوالہ علاء الدین سے دو سو برس بعد سکندر لودھی کے دور سلطنت میں ملتا ہے۔ صاحب تاریخ داؤدی نے لکھا ہے کہ سکندر لودھی ایک موقع پر ہندوؤں کی مذہبی آزادی میں مداخلت کرنے اور تشدد سے کام لینے پر آمادہ تھا۔ اس نے علما کی ایک مجلس منعقد کی۔ علما نے سوال کیا کہ "ہندوؤں کے متعلق پچھلے سلاطین دہلی کا کیا طرز عمل رہا ہے؟" سلطان نے جواب دیا: "اس وقت تک انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ مکمل رواداری برتی ہے۔" ملک العلما نے کہا: "یہ قطعاً نامناسب ہے کہ ہندوؤں کے مندروں کو توڑا جائے یا ان کے ساتھ کوئی زیادتی کی جائے، یا انہیں مذہبی مراسم کی ادائیگی سے باز رکھا جائے، یہ سب ہرگز جائز نہیں ہو سکتا۔" سلطان یہ سن کر نہایت غضب ناک ہوا اور تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر کہا: "تم کافروں کی جانب داری کرنا چاہتے ہو؟" ملک العلما نے جواب دیا: "ہر شخص کی زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے، پادشاہ نے پوچھا ہے، تو میں نے شریعت محمدیؐ کا منشا بتادیا۔ اگر پادشاہ اس کا احترام نہ کرنا چاہے تو پوچھنا بے کار ہے۔" اس فقیہ کی دیانت سے پادشاہ پر ایسا اثر پڑا کہ اس نے اپنا خیال بالکل چھوڑ دیا۔ (تفصیلات کے لیے دیکھو ج ۴، ص ۴۰۲)

ہم اس تاریخی حوالے کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

ہندوؤں کا خیال ان سلاطین کے متعلق کیا تھا؟

فیروز شاہ اور محمد تغلق کے متعلق یہاں تک مشہور تھا کہ انہوں نے جوالا مکھی کے مندر میں مورتی پر چھتری لگائی تھی۔ (ج ۳، ص ۳۱۸)

ہو سکتا ہو یہ روایت بالکل بے بنیاد ہو، لیکن اتنا پتا چلتا ہے کہ ان میں سے بعض سلاطین کو کس حد تک بے تعصب سمجھا جا سکتا تھا۔

مؤرخوں نے جزیہ کے متعلق بہت سے دفتر سیاہ کیے ہیں لیکن یہ ماننا مشکل ہے کہ جزیہ جس کے بدلے میں ہندو ہر قسم کی جبریہ خدمات سے معاف رہتے تھے اور جو ان کے جان و مال کی حفاظت کا بھی ذمہ دار تھا، وہ موجب شکایت سمجھا جاتا تھا، اس کے بارے میں مسٹر طامس کا قول نقل کر دینا کافی ہوگا:

"جزیہ دراصل ایک سرسری قسم کا انکم ٹیکس تھا جس کی مقدار مختلف طبقوں کی استطاعت کے لحاظ سے کم و بیش ہوتی تھی۔ ایک معنی میں وہ امتیاز انگیز ضرور تھا۔ لیکن وہ سادہ، آسانی سے جمع ہو جانے والا انگریزی انکم ٹیکس کی پیچیدگیوں سے بدرجہا فائق تھا۔"

(کرانکلس ص ۴۳۳ نوٹ ۲)

ان چند سطور سے ناظرین کے ان خیالات میں کچھ فرق ضرور پڑ گیا ہوگا جو ان سلاطین کی مفروضہ سختیوں کے متعلق پھیلے ہوئے ہیں۔ ان سلاطین کا طرز عمل ہندو امرا کے ساتھ کیسا تھا، اس کی بھی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

برنی نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ دیوگر کے راجہ نے اپنا سالانہ خراج علاء الدین کو ادا نہیں کیا۔ اس پہ فوج کشی ہوئی جس میں راجہ کو شکست ہو گئی اور وہ گرفتار ہو کر بادشاہ کے سامنے لایا گیا۔ علاء الدین نے اس پر بڑی مہربانیاں کیں۔ اسے رائے رایاں کا خطاب دیا۔ ایک لاکھ تنکہ عطا کیا اور مع اہل و عیال، نہایت عزت سے اس کی ریاست پر ہی اسے واپس بھیج دیا۔ راجا بھی پھر ہمیشہ مطیع رہا، اور اپنا خراج وقت پر بھیجتا رہا۔ (ج ۳، ص ۲۰۰۔۲۰۱)

مسالک الابصار کے مصنف نے ایک اور قصہ لکھا ہے۔ جس سے سلاطین دہلی کے طرز عمل پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ سلطان محمد نے ایک ہندو راجا کے خلاف جس کا ملک دیوگری کے قریب

تھا، ایک فوج بھیجی۔ وہ مطیع ہو کر بادشاہ کے پاس آگیا۔ جب سلطان کے روبرو آیا تو اس نے راجا پر اعزاز کی بارش کر دی۔ راجا نے اپنا مال و دولت بادشاہ کی نذر کرنا چاہا لیکن سلطان نے اسے ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے کہا تم دہلی میں رہو اور اپنے ملک میں اپنا نائب بھیج دو۔ بادشاہ نے مصارف کے لیے راجا کا اچھا وظیفہ مقرر کر دیا، اور اپنی رعایا سمجھ کر اس کے ملک کے لوگوں کے لیے بہت سی خیرات بھیجی۔ (ج ۳، ص ۵۸۴)

عفیف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ خلجی کے زمانے میں بھی یہ طرز عمل حسن سلوک کا جاری رہا۔ لکھا ہے کہ رائے جاج نگر مدت تک سلطان فیروز سے مقابلہ کرتا رہا۔ لیکن جوں ہی اس نے اطاعت کی طرف میلان دکھایا تو سلطان نے خلعت و علامات حکومت مہتاؤں اور راؤں کے ہاتھ اس کے پاس بھیج دیں۔

(ج ۳ ص ۳۱۵)

نگر کوٹ کے راجا نے بغاوت کے بعد معذرت چاہی تو سلطان نے نہایت بردباری کے ساتھ اپنا ہاتھ اس کی پیٹھ پر رکھا اور خلعت اور شتر دے کر بڑی عزت کے ساتھ اس کے قلعہ میں واپس بھیج دیا۔ (ج ۳، ص ۳۱۹)

یہی حال سلطان فیروز کا بابنیہ اور جام کے متعلق لکھا ہے، وہ سندھ و گجرات کے راجا تھے۔ جب بابنیہ سلطان کے روبرو آیا تو بادشاہ نے شفقت سے اپنا ہاتھ اس کی پشت پر رکھا اور کہا: "تم مجھ سے اتنا ڈرتے کیوں ہو؟ میں کسی کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتا نہ ہی تمہیں۔ دل خوش رکھو، تشویش کو دور کرو، جو تمہاری حالت پہلے تھی اس سے دوچند بہتر پاؤ گے۔" پھر حکم دیا کہ ایک عربی گھوڑا بطور انعام دیا جائے۔ اسی دن جام حاضر ہوا تو اس کے ساتھ بھی ایسا ہی برتاؤ ہوا۔ اور اسے اور اس کے ساتھیوں کو قیمتی خلعت دیے گئے (ج ۳، ص ۳۳۵) وہ سلطان کے ساتھ دہلی چلے آئے۔ اور مؤرخ کا بیان ہے کہ انہوں نے وہیں سکونت اختیار کر لی تھی اور ان کے اہل و عیال شاہی محل کے پاس آرام سے رہتے تھے۔ ہر ایک کو شاہی خزانہ سے دو لاکھ تنکہ ملتا تھا اور اس کے علاوہ بھی اتنی مہربانیاں ہوتی رہتی تھیں کہ وہ اپنے وطن ٹھٹھہ کو بھول گئے تھے۔ دربار میں وہ بادشاہ کے سیدھے ہاتھ پر بیٹھتے تھے اور ان کا مقام صدر جہاں (چیف جسٹس) سے دوسرے نمبر پر شیش محل میں ہوتا تھا۔ (ج ۳، ص ۳۳۸)